کلام اقبال میں کردار نگاری

ماہرالقادری

اقبال کے کلام، پیغام اور شخصیت پر اتنا لکھا گیا ہے کہ شاید ہی دنیا کے کسی شاعر پر اتنی کم مدت میں کمیت ہی نہیں، کیفیت کے اعتبار سے بھی اسقدر لکھا گیا ہو، کتابوں پر کتابیں ہیں کہ اقبال پر آتی چلی جا رہی ہیں، مگرنہ پڑھنے والے سیر ہوتے ہیں اور نہ لکھنے والے اکتاتے ہیں! ''اقبالیات،، کی تکرار بھی لطف سے خالی نہیں ہے کہ اس اعادہ و تکرار سے ذوق و وجدان پریشان اور متوحش ہونے کے بجائے، لذت اندوز ہوتے ہیں، اس تکرار میں اس قدر تازگی ہے ــــــ کہ:ـ

سو بار بھی ہم کہہ کے مکرر نہیں کہتے

جس طرح ساحل پر بیٹھکر کوئی بڑے سے بڑا نظر باز بھی دریا کی موجوں کو نہیں گن سکتا، یہی حال اقبال کے کلام کی خوبیوں کا ہے، فکر و تفلسف سے لیکر اظہار و بیان تک اور معانی سے لیکر الفاظ تک حسن و خوبی کے جواہر ہیں کہ معدن سے نکلتے چلے آرہے ہیں ــــــ اقبال کے کلام میں جہاں دوسری گونا گوں خصوصیات اور محاسن پائے جاتے ہیں، وہاں ایک قابل ذکر خصوصیت ''کردار نگاری،، ہےـ

کردار نگاری کا نام لیتے ہی لوگوں کا ذہن عام طر پر ناولوں اور افسانوں کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ یہ شاعری کی نہیں ناول و افسانہ کی خصوصیت ہے، یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے، مگر اس موضوع پر بحث و گفتگو میں یہ حقیقت بھی تو نگاہوں سے اوجھل نہ رہنی چاہئے کہ منظوم ڈراموں اور مثنویوں میں بھی کردار نگاری ملتی ہے، اور ناولوں، ڈراموں اور افسانوں کی طرح شروع سے آخر تک کردار ساتھ ساتھ چلتے ہیں، مگر ان کرداروں کے جہاں تک برتنے کا تعلق ہے، نثری ڈراموں اور افسانوں کے کرداروں سے نظم کے کردار اپنی ٹیک نک کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں ـ

ناول اور افسانہ کے کردار حقیقی شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں ''افسانہ،، کا لفظ ہی حقیقت سے اپنی دوری کا اعلان کرتا ہے، جہاں کہیں کرداروں میں

حقیقت، اصلیت اور واقعیت ہوتی بھی ہے — تو افسانہ نگار اور ناول نویس اپنے پلاٹ کو مربوط رکھنے اور افسانہ و ناول کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنانے کے لئے اس میں خاطر خواہ تصرف کرکے تخیل و بیان کا ایک طلسم کھڑا کر دیتے ہیں، مگر اقبال کے یہاں نہ صرف یہ کہ افسانوں اور ناولوں سے بلکہ بزمیہ اور رزمیہ مثنویوں سے بھی کردار نگاری مختلف ملتی ہے وہاں تفصیل ہے، یہاں ایجاز ہے، وہاں پھیلاؤ ہے، یہاں سمٹاؤ ہے، وہاں ایک قطرے کو، وسعت دیکر دریا بنایا جاتا ہے اور یہاں دریا کو ایک کوزے میں نہیں بلکہ ایک قطرے میں بند کیا جاتا ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اقبال کے کلام میں کردارنگاری حقیقت کی ترجمان ہوتی ہے، اقبال کو جس کسی نے بھی سب سے پہلے ''ترجمان حقیقت،، کہا اس نے بڑی حقیقت شناسی اور خوش ذوق کا ثبوت دیا۔

ایشیائی شاعری میں قصیدہ شاعری کی مقبول و پسندیدہ بلکہ یوں کہنا چاہئے معرکہ آراء صنف ہے، قصائد میں سب سے زیادہ موثر، پر لطف اور کام کی چیز ''تشبیب،، ہوتی ہے، شاعر کے تخیل اور قوت بیان کے جوہر تشبیب ھی میں کھلتے ھیں، ''گریز،، کے بعد تو قصائد میں آورد کا رنگ آ جاتا ہے، پھر یہ ''آورد،، بھی مبالغہ آمیزی کی اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ وجدان اسکے غیر واقعی ہونے پر تلملا کر رہ جاتا ہے۔ ظہیر فاریابی نے قزل ارسلاں کی مدح میں یہاں تک کہہ دیا۔

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پائے
تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دھد

کوئی شک نہیں یہ شعر بہت پر شکوہ ہے مگر یہ شکوہ واقعیت اور فطرت کے کسقدر خلاف ہے۔

قصائد میں ''کردار نگاری،، کی جھلک کہیں کہیں ملتی ہے، عام طور پر مدح و منقبت کی مبالغہ آمیزی سے اس بزم کو سجایا جاتا ہے، شجاعت، سخاوت، دریادلی، رعایا پروری، عدل و انصاف اور علم دوستی یہی اوصاف ھیں جو قصائد میں پیش کئے گئے ھیں، اور ان قصائد کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام امراء و سلاطین ایک ھی قسم کے کردار رکھتے ھیں۔

بادشاہوں اور امیروں کی مدح و توصیف کے بعد ان کو دعائیں بھی دی جاتی ھیں، غالب نے سراج الدین بہادر شاہ ظفر کے لئے دعا کی اور اس مضمون کو مبالغہ کی اس حد تک پہنچا دیا کہ اسکے آگے تخیل کی پرواز کے لئے گنجائش ھی نہیں رہتی۔ فرماتے ھیں:—

تا خدا باشد، بہادر شاہ باد

صنف قصیدہ میں کوئی شک نہیں کہ مصنوعی کردار نگاری ملتی ہے۔ مگر اس صنف نے زبان و ادب کو بہت کچھ دیا ہے، ابو تمام نے معتصم باللہ کے دربار میں جو قصیدہ پڑھا تھا، اسکے اس شعر کا زور بیان، تخئیل کی پرواز اور الفاظ کی سحرکاری دیکھئے:

السیف اصدق انباء من الکتب — تلوار کتابوں سے زیادہ سچ بولتی ہے

فی حدہ الحد بین الجد واللعب — اسکی باڑھ سنجیدگی اور ٹھٹول کے مابین حد فاصل ہے

جاہلیت کے عرب شعراء کی یہ خصوصیت انھیں عجمی شعراء سے ممتاز کرتی ہے کہ وہ بادشاہوں اور امیروں کی مدح نہیں کرتے تھے، عرب شعراء میں غالباً سب سے پہلے نابغہ ذبیانی نے اس عار کوگوارا کیا، شعرائے جاہلیت خود اپنی اور اپنے خاندان اور اسلاف کی مدح و توصیف میں شعر کہتے تھے، یعنی وہ خود اپنے قصیدہ خواں اور منقبت نگارتھے، عمرو بن کلثوم کے قصیدہ کا ایک شعرسنئے:—

اذا بلغ الفطام لنا صبی
تخرلہ الجبابر سا جدینا

ہمارے قبیلے کا بچہ جب دودھ چھوڑتا ہے—تو بڑے بڑے صاحبان حیرت و جلال اسکے آگے سجدے میں گر پڑتے ہیں

یہی وہ مشہور قصیدہ ہے جو سونے کے پانی سے لکھ کر حرم کعبہ کے دروازہ پر آویزاں کیا گیا تھا اور اسکو اسی بنا پر "معلقہ" کہا جاتا ہے۔ جاہلیت عرب کے ان قصائد میں قبیلوں اور خاندانوں کی سادہ اور فطری کردار نگاری بھی ملتی ہے مگر اس سادگی کو مبالغہ آرائی کچھ سے کچھ بنا دیتی ہے۔ خاص طور سے اس وقت جبکہ شاعر دوسرے قبیلہ اور خاندان کے مقابلہ میں اپنے قبیلہ کی برتری کا اظہار کر رہا ہو—

جاہلیت کے عرب شعراء جب وصل و اختلاط کے مضامین نظم کرتے ہیں تو متانت و سنجیدگی اور تہذیب و غیرت کی تمام حدوں کو پھلانگ جاتےہیں، یوں سمجھئے کہ عرب کا جاہلی ادب اپنے زمانہ کا "ترقی پسند ادب" ہے۔ یہ وہ کردار نگاری ہے، جس سے غیرت و حیا پناہ مانگتی ہے—

شاعری کی شوخی اور رنگینی کے ہم منکر نہیں ہیں، وصل و اختلاط کی جھلکیاں بھی شعر میں آتی ہیں مگر یہ بڑا ہی نازک مقام ہوتا ہے یہاں شاعر کو

تلوار کی باڑھ پر چلنا پڑتا ہے جسکے دونوں طرف نازک آبگینے چنے ہوتے ہیں، ذرا سی بے احتیاطی سے یہ آبگینے چور ہو جاتے ہیں، جن ہوس پرست شاعروں نے وصل و اختلاط کے عمل (Process) کو شاعری میں نظم کر دیا انہوں نے تہذیب و انسانیت اور خود شعر و ادب کیساتھ مذاق بلکہ ظلم کیا، شاعر کتنا ہی رنگین اور آوارہ مزاج کیوں نہ ہو، وہ بہر حال انسان ہوتا ہے جانور نہیں ہوتا، اور انسانیت و حیوانیت میں سب سے نمایاں فرق ''امتیاز حدود،، کا ہے اقبال کے کلام میں (Romance) کی شوخی و رنگینی کیساتھ تہذیب و شرافت کا امتزاج دیکھنے کے قابل ہے—

بخلوتش چو رسیدی نظر باو مکشا
کہ آن دمے ست کہ کار از نظارہ می گزرد

اور

دختر کے برھمنی، لالہ رخی سمن بری
چہرہ بروئی او کشا، باز بخویشتن نگر

طبیعت کا تقاضا ہے کہ اس بحث کو دراز تر کیا جائے مگر طبیعت کے اس تقاضے کو اگر پورا کیا گیا تو ہم اصل موضوع سے دور چلے جائیں گے——ہاں! تو ذکر تھا شعر و سخن میں ''کردار نگاری،، کا! سعدی کے نظم کا ایک مصرعہ ہے—

چہ خوش گفت فردوسی پاک زاد

اس میں فردوسی کی تعریف تو بیشک کی گئی ہے مگر ''پاک زاد،، سے فردوسی کے کردار کی عکاسی اور ترجمانی نہیں ہوتی، ''پاک زاد،، ایک ایسی صفت ہے، یا مدح و توصیف ہے جسے ہر شخص سے منسوب کیا جا سکتا ہے، اس شعر میں خود شاعری کی عظمت، شرافت نفس اور بے تعصبی کی جھلک ضرور ملتی ہے کہ اس نے مذہبی معتقدات کے اختلاف کے باجود فردوسی کو ''پاک زاد،، کہا—

کسی شخص کے کردار کا تجزیہ پوری تفصیل اور شرح و بسط کے ساتھ نثر اور نظم میں کیا جاسکتا ہے اور کیا ہی جاتا ہے مگر شاعری کا کمال اس میں ہے کہ کم سے کم لفظوں میں کردار بیان کیا جائے، لیکن یہ ''کم سے کم لفظ،، اگر مبہم اور گنجلک ہوکر رہ جائیں اور کردار کی تصویر دھندلی پڑ جائے، تو یہ شاعری کا نقص ہے—

اقبال کا شاعرانہ کمال اور کردار نگاری کا اعجاز یہ ہے کہ اس نے ایک ایک شعر اور ایک ایک مصرعہ میں کردار کا جوہر اور شخصیت کا ست نکالکر رکھ

دیا ہے، شاعری میں یہ کمال و اعجاز اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے، جبکہ شاعر نفسیات کا ماہر ہو، ساتھ ہی کرداروں کی تہہ میں اتر کر اسکا پتہ لگایا ہو کہ فلاں کردار کا مرکزی نقطہ، مزاج غالب اور وہ ممتاز وصف کیا ہے جو پورے کردار پر چھایا ہوا ہے اور پوری شخصیت کو گھیرے ہوئے ہے - پھر اس کردار شناسی کے بعد شاعر کو جو گوہر مقصود ہاتھ آیا ہے اسکو پرونے کا سلیقہ بھی اسے آنا چاہئے، اگر کردار اور نفسیات کا یہ مشاہدہ اور مطالعہ موزوں الفاظ کےقالب میں نہ ڈھل سکے، تو شاعری اپنے حسن اور تاثیر کو کھو دیتی ہے! عروس جمیل، لباس حریر اور جامہ موزوں ہی میں بھلی لگتی ہے!

اقبال کی شاعری میں خیال و اظہار کے درمیان جو معجزانہ ہم آہنگی نظر آتی ہے، اسی نے تو سب کے دل موہ لئے ہیں، فلسفہ کی کیسی کیسی سخت چٹانیں ہیں، جنکو اقبال نے تراش کر نازک و خوش رنگ پھول پتیاں بنائی ہیں اور تیشہ سے میناکاری کا کام لیا ہے۔

اقبال کی کردار نگاری کی چند مثالیں:

اتنے میں وہ رفیق نبوت بھی آگیا
جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ذات رسالت مآب سے جو والہانہ محبت تھی، وہی انکے کردار و سیرت کا خلاصہ اور مرکزی نقطہ ہے! سب سے پہلے اقبال نے صدیق اکبر کو ''رفیق نبوت،، کہا کہ حضور کی جوانی سے لیکر دم وصال تک صدیق کی رفاقت ثابت ہے، حرم کعبہ ہو، غار ثور ہو، ہجرت ہو، فتح مکہ ہو، بدر ہو، حدیبیہ ہو، ہر مقام پر وہ نبی کے رفیق رہے، یہاں تک کہ قبر میں بھی حضور کے رفیق ہیں، صدیق کی اسی رفاقت نے اردو زبان و ادب کو ''یار غار،، کی اصطلاح دی کہ، جس شخص کا کسی شخص سے حد درجہ کا دوستانہ، یارانہ اور اخلاص و محبت ہوتا ہے، اسے ''یار غار،، کہا جاتا ہے:

عشق و محبت کی اولین شرط یہ ہے کہ محب اپنے محبوب کے چشم و ابرو کے اشاروں پر چلتا ہو، دوست کا رضا جو ہو، اس کی ہر بات اور ہر قول کی تصدیق کرتا ہو، اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کو دین و ایمان سمجھتا ہو، صدیق اکبر کے عشق و محبت کو جب اس کسوٹی پر جانچتے ہیں تو وہ کھرا ثابت ہوتا ہے!

مصر کے ادیب اور مایہ ناز سیرت نگار محمود العقاد نے بڑی دل نشیں بات کہی کہ ابوبکر کے سامنے پہلے محمدص کی شخصیت تھی پھر نبوت تھی اور عمر بن الخطاب

کے سامنے پہلے نبوت تھی، پھر محمدص کی شخصیت تھی، حضور کی ذات گرامی سے اس بے پناہ محبت اور والہانہ عقیدت کا یہ اثر تھا کہ بالغ مردوں میں نبوت کی سب سے پہلے تصدیق حضرت ابوبکر ہی نے کی! عشق و محبت میں چاہنے والے کی مرضی محبوب کی مرضی میں فنا ہو جاتی ہے، صدیق اکبر کی پوری زندگی اسی بے چون و چرا اطاعت کی شہادت دیتی ہے، اعتماد و تصدیق اور یقین و اطمینان کا یہ کمال دیکھئے کہ ابو جہل کی زبان سے حضور کے بیان کئے ہوئے واقعہ معراج کو سنکر صدیق اکبر اسکی تصدیق کرتے ہیں، اور انکی عقل اس حیرت انگیز واقعہ کو درست و صحیح ماننے میں ایک لمحہ کے لئے بھی تامل نہیں کرتی، اس تشریح و وضاحت کے بعد ایک بار پھر اس شعر کو پڑھئے—

اتنے میں وہ رفیق نبوت بھی آگیا
جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار

حضرت ابوبکر کی ذات و شخصیت اور سیرت و کردار سے ''بنائے عشق و محبت کا استوار،، ہونا اگرچہ کمال عشق و محبت ہے، مگر اس میں مبالغہ نہیں ہے، عشق رسول کا دعوی کرنے والوں کو ہر آن اپنے نفس اور اعمال کا جائزہ لیتے رہنا چاہئے کہ ''صدیقیت،، سے مشابہت میں کہاں کہاں کمی پائی جاتی ہے—

پوچھا حضور سرور عالم نے اے عمرؓ!
اے وہ کہ جوش حق سے ترے دل کو ہے قرار

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مقدس کردار کو جو گونا گوں صفات کا مجموعہ ہے ایک مصرعہ میں بیان کر دینا خود اپنی جگہ—

شاعری جز و یست از پیغمبری

کا نمونہ بلکہ شاہکار ہے: اقبال کی شاعری سکون و قرار کی نفی کرتی ہے، اقبال تو حرکت و اضطراب کا داعی ہے، یہاں تک کہ سارا جہان وصل محبوب کی تمنا کرتا ہے— مگر اقبال محبوب کا وصال بھی نہیں چاہتا، کیوں؟ اس لئے کہ—

عشق بمیرد ز وصل

زندگی نام ہے تڑپنے اور بے چین رہنے کا، قرب و وصل کے بعد تشنگی جاتی رہی اور تڑپ مٹ گئی تو عشق و محبت کا یہ بہت بڑا المیہ (ٹریجڈی) ہے، اقبال نے اس مصرعہ میں—

اے وہ کہ جوش حق سے ترے دل کو ہے قرار

اس چیز کو پیش کیا ہے کہ جسکے دل کو جوش حق سے قرار آئیگا، خود اسکا جوش حق کے سبب بیقراری کا کیا عالم ہوگا! — تو اقبال نے اس مصرعہ میں فاروق اعظم کے کمال اضطراب کو مصور کیا ہے—

بھی ''جوش حق،، ہے جسکے ارد گرد عمر فاروق کی پوری زندگی اور تمام کردار گردش کرتا ہے، ایمان لانے کے بعد وہ حرم کعبہ میں آکر کھلے خزانے نماز پڑھتے ہیں، بلکہ مکہ سے مدینہ کو ہجرت کرتے ہیں تو اعلان کرکے ناقہ پر سوار ہوتے ہیں، غزوہٗ بدر کے بعد جب قیدیوں کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو بھی جوش حق ہے جو زبان حال سے یوں بولتا ہے کہ:—

''ہم میں سے ہر شخص اپنے اپنے عزیز کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے،،

غزوہٗ بدر میں کفار قریش کی شکست فاش کے بعد جب عمیر زہر میں تلوار بجھا کر رسول اللہ صلی الہ علیہ وسلم کو خاک بدھن گستاخ قتل کرنے کے لئے مدینہ آتے ہیں، تو بھی جوش حق کا پیکر عمرؓ اس شخص (عمیر) کا دونوں ہاتوں سے گلا دبائے ہوئے، اسے لیکر حضور کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور بات چیت کرتے اور ہاتھوں کو جنبش دیتے ہوئے، کسی کافر سے گستاخی یا سوء ادبی سرزد ہوتی ہے، تو عمر فاروق کا یہی جوش حق ہے، جو انکے ہاتھ میں تلوار کو کھا دیتا ہے۔ صلح حدیبیہ میں عمر فاروق نےجس جوش کا اظہار کیا وہ کوئی نسب و خاندان کی عصبیت کا جوش نہیں تھا، بلکہ حق کا جوش تھا ، وہ اپنی ظاہر بین نگاہ سے یہی دیکھ رہے تھے کہ صلح کی شرطوں سے باطل کے مقابلہ میں حق دب رہا ہے، ان کی رائے صحیح نہ تھی کہ یہی صلح ''فتح مبین،، ثابت ہوئی، مگر ان کی نیت بخیر تھی! حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ جوش حق ہی تھا کہ فوجی نقطہ نگاہ سے عین نازک موقع پر حضرت خالد ابن ولید رضی اللہ عنہ کو عساکر اسلامی کی سپہ سالاری سے برطرف کر دیتے ہیں، اور یہ کارنامہ وہی صاحب عزیمت شخص انجام دے سکتا ہے، جسے اپنے جوش حق پر اعتماد ہو کہ کوئی سنگین واقعہ ظہور میں آگیا تو اس سے پوری طرح نمٹ لونگا، ساتھ ہی وہ اپنی فوج کے سپہ سالار کا پوری طرح مزاج شناس ہو، کہ ادھر سے اطاعت ہی کا معاملہ کیا جائیگا، عمر فاروق کا یہی جوش حق تھا، جسکی دھاک چاروں طرف بیٹھی ہوئی تھی اور اسلامی حکومت کے عمال اور حکام عمر رضؓ کے احتساب سے ڈرتے تھے۔

عرب میں مشہور تھا کہ مرحب پہلوان اپنی جگہ سو پہلوانوں کے برابر تھا، ممکن ہے اس میں تھوڑا بہت مبالغہ بھی ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ جوش حق ہی کی بدولت عمر فارق کی تنہا ذات جرار لشکروں پر بھاری تھی—ہم آرام پسندوں کو اور نکموں کو اللہ کرے عمر فاروق رضؓ کے جوش حق کا ایک ذرہ ہی میسر آجائے! (آمین)

لیکن بلال وہ حبشی زادہ فقیر
فطرت تھی جسکی نور نبوت سے مستنیر

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی یہی فطرت جسکو اقبال نے ''نور نبوت سے مستنیر،، کہا ہے، بلال کا اصل کردار اور حقیقی سیرت ہے! سیاہ رنگت مگر دل روشن و مصفا، ایمان لانے کے بعد حضور کی رحلت تک پوری زندگی حضور ہی کے قدموں میں گزار دی اور مشکوۃ نبوت سے کسب نور کرتے رہے۔ فقر میں، زھد و قناعت میں، عبادت و اطاعت میں، معاملت اور معاشرت میں، حضرت بلال کے یہاں انوار محبت ہی جھلکتے اور جھم جھم کرتے نظر آتے ہیں۔ بارگہ نبوت کے اس تقرب کے سبب، بلال حبشی کی قسمت پر نہ جانے انصار و قریش میں کون کون غبطہ کرتا ہوگا، حضرت بلال کی اسی نورانی فطرت اور روشن و تابناک سیرت کو دیکھکر، ان کی وفات پر عمر فاروق جیسے جلیل القدر صحابی اور جانشین رسول کی زبان حق ترجمان یوں گویا ہوئی کہ—

''آج ھمارا سردار مر گیا،،

حضرت سیدۃ النسا فاطمہ" الزھراء رضی اللہ عنہا کی مقدس و معصوم سیرت و کردار اور پاک وطاھر معاشرت پر اقبال کا یہ ایک مصرعہ—

آسیا گردان و لب قرآن سرا

کسقدر جامع اور حقیقت کا ترجمان ہے، اس مصرعہ کے دو اجزا ھیں ایک ''آسیا گردان،، اس سے حضرت سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کی سادہ معاشرت، جفا کشی اور ایثار پسندی کی تصویر کھچتی ہے اور دوسرا جز ''قرآن سرا،، ہے، جو حضرت سیدہ کے کمال دین داری پر دلالت کرتا ہے، چکی پیستے میں قرآن کریم سے یہ شغف یقیناً اس معصوم و مقدس کردار کا پرتو اور ظل ہونا چاھئے، جسکی شان میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ''کان خلقہ القرآن،، فرمایا تھا—

''آسیا گردانی،، سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ جو خاتون چکی پیستی ہو، اسکو گھریلو زندگی سے کتنا لگاؤ اور تدبیر منزل سے کسقدر شغف ہوگا، امور خانہ داری میں دلچسپی لینا ہی عورت کی شرافت و عظمت کی دلیل ہے—پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ چکی پیستے میں عورتیں عموماً گیت گایا کرتی ھیں تاکہ دل بہلتا رہے اور چکی کی مشقت ھلکی ہوتی رہے

—تو—

وہ خاتون جسکا دل قرآن کریم کی تلاوت سے بہلتا ہو، اور یہی اسکا گیت، نشید اور حدی ہو، اسکا کردار لازماً قرآنی اخلاق کے سانچے ہی میں ڈھلا ہوگا—

تین کردار ھیں—مولانا رومی، امام رازی، اور بو علی سینا کے کردار! یہ

تینوں شخصیتیں اپنی اپنی جگہ بلند ہیں۔ مگر اقبال جسکی فکر و نگاہ نے کتاب و سنت کے دامن میں پرورش پائی ہے اور جسکے مشاہدہ و تفکر کا زاویہ نگاہ قرآنی اور اسلامی ہے، وہ ان تینوں کرداروں میں فرق کرتا ہے!

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

''سوز و ساز،، یہ مولانا رومی کی زندگی اور ان کا کردار ہے اور یہی اہل دل کا کردار ہوا کرتا ہے، ''سوز و ساز،، سے دل کی تڑپ اور ساتھ ہی دل کے کیف و نشاط کی ترجمانی ہوتی ہے، تصوف کی اصطلاح میں غالباً اسی کو ''بسط،، کہا جاتا ہے جو ''انقباض،، کی ضد ہے! صرف سوز ہی سوز ہو تو زندگی خشک و بے کیف بنکر رہ جائیگی اور ساز ہی ساز ہو تو زندگی پر کیف و نشاط کا غلبہ ہوگا، اور یہ دونوں انتہائیں فطرت سے بعد رکھتی ہیں، صحیح فطری تناسب یہ ہے کہ ''سوز و ساز،، ایک جگہ جمع ہو جائیں — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی میں یہی تناسب معراج کمال کو پہونچا ہوا تھا: ایک طرف حضور کی یہ کیفیت کہ دو دو وقت کے فاقے ہوتے تھے اور رات رات بھر اللہ تعالیٰ کے حضور نماز میں کھڑے رہتے تھے یہاں تک کہ پائے مبارک متورم ہو جاتے تھے اور دوسری طرف حضور نے فرمایا کہ میں عورت اور خوشبو کو پسند کرتا ہوں اور سرکار نے تیر اندازی اور شہسواری کی امت کو ترغیب دی۔

مولانا روم کا ''سوز و ساز،، اقبال کا پسندیدہ کردار ہے، اپنے شعروں میں وہ اسے بار بار پیش کرتے ہیں — امام فخرالدین رازی پر عقلیت کا غلبہ تھا مگی دینی اسپرٹ بھی ان کے اندر خاصی ابھری ہوئی تھی، اس لئے اقبال اس کردار سے پیر رومی کے کردار کی طرح دلچسپی تو نہیں رکھتے مگر اس سے بیزار بھی نہیں ہیں، اس کردار کا وہ بہر حال احترام کرتے ہیں۔ تیسرا ''کردار،، بو علی سینا کا کردار ہے، جس پر عقلیت اور عجمیت کا غلبہ ہے، اسی لئے —

بو علی اندر غبار ناقہ گم

کی اقبال نے طنز کی ہے! بو علی سینا مسلمان فلسفی تھا، لیکن اسکے فکر و ذہن پر یونانی فلسفہ غالب تھا، اسلئے وہ اپنی عقل و ذہانت کے جوش میں ان وادیوں میں بھی نکل جاتا تھا جہاں وحی الٰہی سے بےنیاز ہوکر یا تو خود اسکی اپنی عقل رہنما ہوتی ہے یا یونانی فلاسفہ کے افکار اسکے دلیل راہ ہوتے ہیں، اسی لئے وہ اقبال کی نگاہ میں ''غبار ناقہ میں گم ہو کر رہ جاتا ہے،، اور لیلائے مقصود تک نہیں پہونچ پاتا، اس کے برخلاف دوسرا کردار مولانا روم کا ہے، جنکی تمام دانش و عقل اور فہم و شعور وحی الٰہی کے پابند ہیں، اس لئے ان کے ہاتھ لیلائے

مقصود کے پردۂ محمل کو تھام لیتے ہیں اور وحئی الٰہی کی رہنمائی اور روشنی کے سبب ادھر ادھر بھٹکنے نہیں پاتے۔

تڑپ رہا ہے فلاطوں میان غیب و حضور
ازل سے اہل خرد کا مقام ہے اعراف

افلاطون پر کتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، اور اس کا کردار اور افکار ایک ہزار سال سے موضوع فکر و بحث بنے ہوئے ہیں مگر اقبال کا صرف یہ ایک شعر ''فلاطونیات،، کے دفتروں پر بھاری ہے، اس ایک شعر میں افلاطون کے کردار و افکار کی روح کھنچ کر آگئی ہے:۔

اقبال کا ایک اور شعر ہے:۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

اقبال خدا نخواستہ ''عقل،، کا مخالف نہیں ہے اور نہ وہ بے عقلی کو کوئی اچھی چیز سمجھتا ہے، ہاں! یہ ضرور ہے کہ وہ دل کو عقل پر ترجیح دیتا ہے اور اسکے نزدیک ارباب دل کا مقام اہل دانش سے بلند تر ہے، اسلئے کہ عقل طرح طرح کے حیلے تراشتی اور مصلحتوں کی باریکیاں سجھاتی ہے، اور کسی انقلاب آفریں اقدام کیلئے مشکل ہی سے تیار ہوتی ہے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

یہ عقل ہی کی نقطہ آفرینی تھی،جس نے معلم الملکوت کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے سرتابی کی پاداش میں راندۂ درگہ اور ابلیس لعین بنا دیا، جس پر قیامت تک لعنت کی جائے گی (اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم):

افلاطون نہ تو ملحد تھا اور نہ منکر تھامگر ساتھ ہی یقین و ایمان کی وہ متاع بھی اسکے دامن میں نہ تھی جو وحئی الٰہی کے واسطہ سے ملتی ہے اور جہاں تذبذب و تامل کی جگہ یقین، سپردگی اور تسلیم و رضا پائی جاتی ہے اقبال نے افلاطون کو گمراہ نہیں کہا، گمراہی اور الحاد و انکار کے مقابلہ میں ''غیب و شہود،، کے درمیان تڑپتے رہنا ہی بسا غنیمت ہے، اور دوزخ کے مقابلہ میں اعراف ہی بہت بڑی نعمت ہے۔

از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است (سعدی)

مگر ظاہر ہے کہ بہشت کے سامنے اعراف کی کیا حقیقت ہے جس طرح دوزخی اعراف کو بہشت سمجھتے ہیں اسی طرح اہل جنت کے نزدیک اعراف دوزخ کا نمونہ ہے!

اقبال کی نگاہ میں ان تین کرداروں کا موقف یہ ہے۔

(۱) ارباب دل (یعنی اہل ایمان) کا مقام جنت ہے

(۲) خیر پسند اہل عقل (جو منکر و ملحد نہیں ہیں) کا مقام اعراف ہے

(۳) منکر و ملحد اہل عقل کا مقام دوزخ ہے

افلاطون چونکہ خیر پسند تھا اور انکار و الحاد کی طرف اس کا میلان نہ تھا، اسلئے بعض وقت اسکے افکار و تعلیمات پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مسائل اسکو ''القا،، کئے جا رہے ہیں اور وحی و الہام کی پرچھائیاں اسکے فکر و ذہن پر پڑ رہی ہیں، یہ وہ عالم ہے جب وہ ''حقیقت الحقائق،، سے قریب ہوتا ہے، غالباً اسی کو اقبال نے ''شہود،، سے تعبیر کیا ہے جہاں خود حقیقت بر افگندہ نقاب ہوتی ہے، مگر چونکہ انبیاء کرام کے ذریعہ وحی الہی کی رہنمائی افلاطون کو حاصل نہیں ہے، اسلئے جب ذہول طاری ہوتا ہے تو اسکے افکار الجھ جاتے ہیں، اسکی باتیں پیچیدہ ہو جاتی ہیں جیسے کوئی روشنی سے یکایک اندھیرے میں آجائے، یہی افلاطون کے لئے وہ عالم غیب ہے، جہاں حقیقت سے بعد ہو جاتا ہے۔ تو اقبال کی نگاہ میں افلاطون کا یہ کردار ہے کہ کبھی حقیقت سے قرب اور کبھی حقیقت سے بعد، اور اسی قرب (شہود) اور بعد (غیب) کے درمیان وہ مضطرب رہتا ہے!

آرنلڈ اقبال کا شفیق استاد تھا، علم دوست اور نیک نفس مستشرق! مسلمانوں کے علوم و فنون اور انکی تاریخ و تہذیب سے اسکو دلچسپی تھی، ساری زندگی علم و دانش ہی کی طلب و جستجو میں گزار دی، آرنلڈ کا اپنے شاگردوں سے ایسا سلوک تھا جیسے باپ کا بیٹے سے ہوتا ہے۔ کتابیں ہی اس کا اوڑھنا بچھونا تھیں اور علم ہی اسکی زندگی کا مقصد تھا،۔اس کردار کو علامہ اقبال نے اس شعر میں کس عقیدت و محبت کے ساتھ پیش کیا ہے اور کتنی سچی بات کہی ہے۔

تو کہاں ہے اے کلیم ذروۂ سینائے علم

تھی تری موج نفس باد نشاط افزائے علم

یہ شعر کردار نگاری کے ساتھ آرنلڈ کی علمی عظمت کا اعتراف بھی ہے

اقبال ایک صاحب پیغام شاعر ہے اور داغ خالص غزل گو ہے، دونوں کے درمیان فکر و نظر کا کوئی اشتراک نہیں ہے، فکر و خیال کے اختلاف کے ساتھ دونوں کا انداز بیان اور اسلوب اظہار بھی مختلف ہے: اقبال نے جب ہوش سنبھالا تو سارے ہندوستان میں داغ کی غزلوں کی دھوم تھی اور شاعری میں داغ کی ذات مرجع خاص و عام بنی ہوئی تھی، اقبال نے بھی شاعری میں اسی ''جہاں استاد،،

کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، داغ کی زبان میں جو لوچ تھا اور اظہار بیان پر جو حیرت انگیز قدرت تھی اس سے اقبال نے بھی فائدہ اٹھایا، اگر دنیا کے احوال وفات پائے ہوؤں کی روحوں تک پہونچتے ہیں، تو داغ کی روح اپنے شاگرد اقبال کی عالمگیر شہرت اور بے پناہ قبولیت کو دیکھ کر فخر کرتی ہوگی۔

اقبال نے کئی مرثیے کہے ہیں مگر سب سے زیادہ اثر انگیز مرثیہ داغ کا ہے! اپنی ماں پر جو اقبال کا مرثیہ ہے، اس تک میں وہ سوز و درد اور تاثیر نہیں ہے، جو داغ کے مرثیہ میں ہے۔ داغ کے مرنے پر اقبال کے دل کو جو چوٹ لگی ہے وہ نظم کے قالب میں ڈھل کر بڑی دردانگیز بن گئی ہے۔

لکھی جائیں گی کتاب دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خواب جوانی تری تعبیریں بہت
ہو بہو کھینچے گا ،لیکن عشق کی تصویر کون ؟
اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون؟

''عشق کی ہو بہو تصویر کشی''۔اور ''ناوک فگنی''، یہی داغ کی شاعری کا مزاج ہے، داغ کا کمال ہے، داغ کا فن اور اس کا کردار ہے، حسن و عشق کی کیسی کیسی نزاکتیں ہیں جو داغ کی غزلوں میں فلم کی تصویروں کی طرح بولتی ہوئی نظر آتی ہیں اور اسکے شعروں میں وہ سوز و اثر پایا جاتا ہے کہ دلوں میں تیر کی طرح پیوست ہوتے چلے جاتے ہیں، داغ نے شعر نہیں کہے سچ مچ ناوک فگنی کی ہے اور دلوں پر تاک تاک کر تیر مارے ہیں، جو کوئی بھی داغ کے شعروں کو پڑھے گا، ان تیروں کی کسک محسوس کرے گا!

داغ یوں ہی ناوک فگن نہیں بن گیا تھا، خود اسنے بھی اپنے دل پر تیر کھائے تھے، صیاد کبھی صید بھی رہ چکا تھا، اقبال نے داغ کو ''ناوک فگن''، کہہ کر اسکے فن اور کردار کو دو لفظوں میں بیان کردیا۔

اقبال کا یہ شعر۔

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اسکو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے؟

میں نے بارہا پڑھا تھا مگر جب تک نطشہ کی کتاب ''بقول زردشت''، میری نظر سے نہ گزری تھی ''مجذوب فرنگی''، کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آیا تھا، ''مجذوب فرنگی''، کی ترکیب سے نطشے کے افکار و کردار کی جیسی صحیح ترجمانی ہوتی ہے کسی اور لفظ اور لقب سے نہیں ہوسکتی !

شرعی اصطلاحیں بالغ و نابالغ، عاقل و غیر عاقل، مکلف اور غیر مکلف

ہیں، ''مجذوب،، کوئی شرعی اصطلاح نہیں ہے مگر یہ لفظ مسلمانوں میں بہت عام ہے، اور''مجذوب،، کے نام سے ایک عجیب کردار ذہن و فکر کے سامنے ابھر آتا ہے: تصوف میں سالک کا مقام مجذوب سے بہر حال بلند تر ہے، مگر ''مجذوب ،، سے بھی روحانی عقیدت وابستہ ہے !

''مجذوب،، ایک ایسے آدمی کو کہتے ہیں کہ جو غیر مکلف ہو اور اسکے جذب و بے خودی اور فقدان شعور کے سبب اس پر شرعی حدود جاری نہ ہو سکیں: اس کا عالم یہ ہوتا ہے کہ کسی دن ترنگ آئی تو مسجد میں پہونچ گیا اور وہاں جا کر جو نماز پڑھنی شروع کی ہے۔ تو ایک ایک سجدہ آدہ آدہ گھنٹہ میں بھی پورا نہیں ہو رہا ہے، دوسرے دن ٹھیک مغرب کی نماز کے وقت گانا سنا جا رہا ہے اور شراب پی جا رہی ہے، رات خانقاہ میں بسر کی اور دن چنڈو خانہ میں گزارا، باتیں زیادہ تر بے تکی، الجھی اور بھکی ہوئی۔

پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

''مجذوب کی بڑ،، اردو کی معروف اصطلاح بن گئی ہے۔ مگر کبھی کبھی مجذوب کے منہ سے بڑے پتہ کی بات بھی نکل جاتی ہے ، نہ صرف پتہ کی بات بلکہ بہت اونچی بات، جیسے اس شخص کے دل میں یہ نکتہ القا کیا گیا ہے اور اسکے ادراک پر روح القدس کی پرچھائیں پڑگئی ہے۔

نطشہ الہانوی کو اقبال نے ''مجذوب فرنگی،، کہا ہے، اسکے ملفوظات کا بھی یہی عالم ہے کہ صفحے کے صفحے پڑھ جائیے ، کچھ نہیں کھلتا کہ کہنے والے کا مفہوم کیا ہے، پیچیدگی میں پیچیدگی، راز اندر راز، الجھنیں ہی الجھنیں، سچ مچ ''مجذوب کی بڑ،،! مگر کہیں کہیں وہ ایسی اونچی بات کہہ جاتا ہے ، جیسے یہ بات اسنے خود اپنے ارادہ سے نہیں کہی، اس سے کہلوائی گئی ہے ، نیٹشے کے یہاں کہیں کہیں ایسے ''نیم ربانی،، اقوال بھی آگئے ہیں —

''تم نے جو میرے ساتھ برائی کی ہے، اسے میں تو معاف کردوں گا،
مگر تم نے جو اپنے ساتھ برائی کی ہے اسے کون معاف کرے گا،،

نیٹشے کا یہی ''جذب،، مافوق الانسان کی تلاش میں ، مولانا روم کے اس خیال۔

از دام و دد ملولم انسانم آرزوست

کا ہم آواز بن جاتا ہے۔

اقبال کے کلام میں جو تلمیحات پائی جاتی ہیں وہ مستقل پس منظر رکھتی ہیں، اور ان کا اقبال کے پیغام اور افکار سے بڑا گہرا تعلق ہے، ان ''کرداروں،، کو سمجھنے کے لئے اسکی ضرورت ہے کہ ان کرداروں کا پہلے کتابی مطالعہ

کیا جائے اور نہ صرف مطالعہ بلکہ انہیں سمجھا جائے، جس کسی نے مولانا روم کو نہیں پڑھا وہ ''سوز و ساز رومی،، کی لذت کو کیا جانے، جس نے رازی کا مطالعہ نہیں کیا وہ نہیں سمجھ سکتا کہ اقبال نے ''پیچ و تاب رازی،، کہکر کس حقیقت کو بے نقاب کردیا، جو بو علی سینا کے افکار سے واقف نہیں ہے، اس پر—

بو علی اندر غبار ناقہ گم

کی معنویت آشکار ہو ہی نہیں سکتی، جس نے زمخشری کے فن کو نہیں سمجھا، وہ:—

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

میں ''صاحب کشاف،، کی تلمیح کی گہرائی کو نہیں پہونچ سکتا، جو کوئی اشتراکیت کے فلسفہ اور اشتراکیوں کی زندگی سے باخبر نہیں ہے، اسے پتہ نہیں چل سکتا کہ اشتراکیوں کو علامہ اقبال نے ''کوچہ گرد،، کہکر ان کے کردار کی ہو بہو تصویر کھینچ دی ہے:

مسلمانوں میں لیڈر اور قائد تو بہت گزرے ہیں مگر رئیس‌الاحرار مولانا محمد علی جوہر کی زندگی اسلئے ممتاز نظر آتی ہے کہ اس میں دینی اخلاق سموئے ہوئے تھے، انگریز کے دور حکومت میں اول اول نظر بند ہوئے تو قید خانہ سے اسطرح رہا ہوئے کہ چہرہ پر خوب گھنی داڑھی تھی اور قرآن پاک گردن میں حمائل تھا، اسلام کی کسی چھوٹی سی چھوٹی روایت اور شریعت کی ادنیٰ قدر کو بھی خطرے میں دیکھتے تو تڑپ اٹھتے، ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں جب شاردا بل پیش ہوا، جسکی زد مسلمانوں کے دینی مسائل نکاح و ازدواج پر پڑتی تھی، تو بے چین ہوگئے، اور ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا کہ میں اس کی خلاف ورزی کروں گا، شریعت میں مداخلت برداشت نہیں کی جا سکتی، خدا اور رسول کی محبت مولانا محمد علی کے دل و دماغ میں رچ گئی تھی، کیا اسلامی جوش تھا، کیا دینی غیرت تھی (اللہم کثرامثالہم) تو مولانا محمد علی جوہر رحمۃاللہ علیہ کی یہ زندگی جبتک سامنے نہ ہوگی، اس وقت تک اقبال کے اس شعر

خاک قدس اورا بہ آغوش تمنا در گرفت
سوئے گردوں رفت زاں را ہے کہ پیغمبر گزشت

کی لذت سے شوق و وجدان محروم رہینگے!